عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے!

اسلام کے مقابل اسلام

''قائداعظم کے یومِ پیدائش کی تقریب، منعقدہ 24 دسمبر 1982ء پر پرویزؒ صاحب کا خصوصی درس''

غالبؔ نے اپنے متعلق کہا تھا کہ ___ ''قدرِ شعرِ من بگیتی، بعدِ من خواہد شدن ___ دنیا میں میرے شعر کی قدر میرے بعد ہو گی ___ اقبالؔ نے بھی اسی احساس کا اظہار کیا تھا جب کہا تھا کہ ___ من نوائے شاعرِ فرداستم۔'' میں آنے والے شاعر کی آواز ہوں۔ میرا زمانہ میرے بعد آئے گا۔'' مَیں اپنے آپ کو ان اربابِ فکر و بصیرت کے زمرے میں شمار کرنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا، لیکن اس حقیقت کے اظہار سے باز بھی نہیں رہ سکتا کہ جو کچھ میں اسلام کے متعلق کہہ رہا ہوں وہ آنے والے مؤرخ کے لئے یادداشت کا کام دے گا۔ وہ دیکھے گا کہ جب یہاں اسلام پر یہ کچھ بیت رہی تھی تو ایک گوشے سے قرآن کی آواز بھی بلند ہو رہی تھی۔ قرآن کریم نے اپنے اولین مخاطبین (کفار) کے متعلق کہا تھا کہ وہ اپنے گروہ کے لوگوں سے کہتے تھے کہ لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ (41:26)۔ تم اس قرآن کی آواز اپنے کان میں نہ پڑنے دو۔ وَالۡغَوۡا فِيۡهِ (41:26) اور اس قدر شور مچاؤ کہ دوسرے بھی اسے سُننے نہ پائیں۔ لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ (41:26) بس یہی ایک طریق جس سے تم، قرآن کی طرف دعوت دینے والوں پر غالب آسکو گے۔ اگر لوگوں نے اس کی آواز سن لی تو پھر وہ تمہارے قابو نہیں آسکیں گے۔ یہی ٹیکنیک ہمارے زمانے کے اس ہجوم نے اختیار کر رکھی ہے جو نہیں چاہتے کہ قرآن کی آواز بلند ہونے پائے۔ قرنِ اوّل کے معاندین کے مقابلہ میں ان کے پاس پراپیگنڈہ کے بڑے وسیع اور شدید الاثر ذرائع ہیں۔ عوام ویسے ہی جذباتی ہوتے ہیں۔ اس پراپیگنڈہ نے ان کے

جذبات کو اس قدر دو آتشہ بنا دیا ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر آتش گیر مادہ بن جاتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے دانشور طبقہ کا تعلق ہے، جو کچھ اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا ہے، اس سے وہ مذہب کے نام سے متنفر یا کم از کم (Disinterested) ہو چکے ہیں۔ میرے زمانۂ ملازمت کی بات ہے۔ دفتر میں ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ تھا اور اس کے سیکشن میں ایک ''احمدی'' کلرک۔ ''احمدیوں'' کا تو یہ معمول ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک تک اپنا لٹریچر پہنچاتے ہیں۔ ایک دن اس کلرک نے اپنا کچھ لٹریچر اس سپرنٹنڈنٹ کو دیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ لٹریچر کس موضوع سے متعلق ہے؟ اس نے کہا کہ یہ مذہب سے متعلق ہے۔ اُس نے وہ کاغذات اس کی طرف لوٹا دیئے اور کہا کہ انہیں گرجا کے پادری کے پاس لے جاؤ، اسے اس کام کی تنخواہ ملتی ہے۔ مجھے نہیں، ہمارے دانشور طبقہ کی حالت کچھ ایسی ہی ہو چکی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب ایک ایسا (Subject) ہے جس کا تعلق مولوی صاحبان سے ہے۔ ان سے اُس کا کچھ واسطہ نہیں۔

وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس، مسٹر جسٹس آفتاب حسین نے اس بارے میں گلہ بھی کیا ہے انہوں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ملک کے علماء اور دانشوروں سے اپیل کی کہ وہ ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے وفاقی شرعی عدالت سے تعاون کریں۔ انہوں نے کہا کہ:

> ''انہوں نے بارہا اخبارات میں اشتہارات بھی شائع کروائے لیکن ملکی قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں وکلا اور علماء حضرات نے کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں دکھایا۔ انہوں نے کہا کہ ''علماء زبانی کلامی تو اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے بہت کچھ کہتے ہیں لیکن عملاً انہوں نے تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وفاقی شرعی عدالت کی دعوت پر چند علماء نے کچھ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے سلسلے میں اپنی آراء پیش کی تھیں لیکن انہوں نے اپنی اس رائے میں صرف فقہ کو تحریر کر دیا تھا اور اکثر جگہوں پر قرآن اور حدیث کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ اس لئے ان کی آراء ہماری مناسب مدد نہیں کر سکیں۔ انہوں نے کہا

کہ وکلاء بغیر فیس کے کوئی مشورہ نہیں دیتے، اس لئے وکلاء نے وفاقی شرعی عدالت سے بھی قابل ذکر تعاون نہیں کیا۔''

(روزنامہ جنگ، لاہور، مورخہ 19 نومبر 1982ء)

یہ اُس طبقہ کا حال ہے جس کا براہِ راست تعلق مذہب اور قوانین سے ہے۔ اس سے مذہب کے ساتھ دلچسپی کے متعلق دیگر طبقات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اندریں حالات آپ سوچئے کہ قرآن کی جو آواز میں بلند کر رہا ہوں اس پر کون کان دھرے گا؟ عوام سے کہہ دیا گیا ہے کہ ''یہ کفر ہے۔ الحاد ہے۔ بے دینی ہے۔ اس کے قریب تک نہ جانا۔'' خواص نفسِ مذہب ہی سے لاتعلق ہو چکے ہیں۔ بایں ہمہ میں اس آواز کو بلند کئے جا رہا ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ میں نے اسے اپنی زندگی کا فریضہ قرار دے رکھا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ اس قحط الرجال کے باوجود، ایسے سعادت مند حضرات موجود ہیں جو اس آواز میں دلچسپی رکھتے ہیں اور تیسرے اس لئے کہ میری یہ آواز ریکارڈ میں رہے تاکہ آنے والا مؤرخ اس سے استفادہ کر سکے۔ (ورنہ) جہاں تک قرآن کے ساتھ اس دور کا عمومی تعلق ہے، اس کی حالت ایسی ہو چکی ہے جس کا اقبالؒ نے ان حقیقت افروز لیکن نہایت حسرت افزا الفاظ میں اظہار کیا تھا کہ ___ خوابم ز یاد رفتہ وتعبیرم آرزوست ___ میں نے جو خواب دیکھا تھا وہ تو بھول گیا ہے لیکن میں یہ آرزو دل میں لئے بیٹھا ہوں کہ اس کی تعبیر میرے سامنے آجائے۔

اقبال کا خواب:

اقبالؒ نے ایک خواب دیکھا تھا۔ یہ خواب کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین (نظامِ حیات) حضور ﷺ کی وساطت سے نوعِ انسان کو عطا فرمایا تھا اور جسے آپؐ نے عملاً نافذ کر کے دکھا دیا تھا، اسے پھر سے زندہ حقیقت بنا کر دُنیا کو بتا دینا چاہئے کہ یہ ہے وہ فردوسِ بریں جسے بنی آدم نے تم کو دیا تھا۔ اس نے کہا کہ جو اسلام، مسلمانوں کے مختلف ممالک میں رائج چلا آرہا ہے، وہ دین نہیں جو صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا۔ یہ وہ مذہب ہے جو صدرِ اوّل کے بعد ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ حقیقی دین کے احیاء کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا خطۂ زمین ہو جس

میں پہلے سے کوئی نظامِ حیات ثبت نہ ہو۔ اس میں قرآن کی بنیادوں پر اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے 1930ء میں اس خطۂ زمین کے حصول کو قوم کے سامنے بطورِ نصب العین رکھا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں بتادیا کہ

''اس سے اسلام کو اس امر کا موقعہ ملے گا کہ وہ اُن اثرات سے آزاد ہوکر جو عربی ملوکیت کی وجہ سے اس پر اب تک قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب وتمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی صحیح معنوں میں تجدید ہوسکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہوجائیں گے۔'' (خطبہ صدارت، الٰہ آباد)

اس سے بھی پہلے انہوں نے اپنے ''خطباتِ تشکیلِ جدید'' میں سعید حلیم پاشا (مرحوم) کی ہم نوائی میں کہا تھا:۔

اندریں حالات ہمارے لئے کشادِ کار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور دُرشت تہیں جم گئی ہیں اور جن کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہوکر رہ گیا ہے، انہیں کھُرچ کھُرچ کر الگ کر دیا جائے، اور حُریّت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو ازسرِنو زندہ کر کے ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔ (چھٹا خطبہ)

وہ جانتے تھے کہ اس اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوگی۔ کیونکہ مذہب ان کے لئے ذریعۂ معاش بن چُکا ہے، اور جب حکومت کے ساتھ ان کی ساز باز ہوجائے تو یہ ذریعۂ معاش ہی نہیں رہتا، وجۂ حصولِ اقتدار بھی بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس حقیقی اسلام میں اس انسٹی ٹیوشن کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ آپ کلامِ اقبالؔ کو شروع سے اخیر تک دیکھ جایئے۔ اس میں آپ کو مُلاّ کی مخالفت، شدومد سے ملے گی۔ وہ ان کے وجود کو مسلمانوں کی تباہی کا اولیں سبب قرار دیتے ہیں۔ وہ مسلمان سے واضح طور پر کہتے ہیں کہ ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کُشتۂ سلطانی و مُلائی و پیری

اپنے کلام کے علاوہ، وہ دیگر مقامات پر بھی اسی خطرہ کو دُھراتے رہے۔ اُنہوں نے آل انڈیا مسلم کانفرنس (منعقدہ مارچ 1932ء) میں اپنے خطبہ صدارت کے دوران فرمایا:

ملائیت کے خلاف:

ہمارے دین کی یہ بلند فطرتی مُلاّؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے، اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم جذبات اور حالات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں۔ جسے صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر رکھا ہے۔ ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تا کہ وہ پھر نئی آرزوؤں نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس نئی مملکت کے نظام کی بنیاد قرآن خالص ہوگی۔ اور یہی چیز ہماری مذہبی پیشوائیت کے لئے بناء مخالفت ہوگی۔ اس لئے ان کا مقابلہ کرنا بڑی جرأت طلب اور صبر آزما مہم ہوگی۔ انہوں نے اپنے خطبات میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:

’’یہ سوال زُود یا بدیر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدو جہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دُنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر بڑھے۔۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا اور حُریت پسند قلب ہے جسے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ:

حسبنا کتاب اللہ

ترجمہ: ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

وہ جانتے تھے کہ جس نظام کی بنیاد قرآنِ خالص پر ہوگی وہ دنیا کے ہر غیر قرآنی نظام کا مخالف ہوگا۔ اس میں ہر قسم کی شخصی حکومت کی مخالفت ہوگی خواہ وہ ملوکیت ہو یا آمریت، حتیٰ کہ مغرب کی جمہوریت بھی۔ اس میں مغرب کی استعماریت کی بھی مخالفت ہوگی۔ اور وطن اور نسل کی بنیادوں پر نیشنلزم کی بھی۔ اس میں نہ مغرب کا نظامِ سرمایہ داری بار پا سکے گا نہ ہی روس کا اشتراکی نظام۔

ہر طرف سے مخالفت:

اس اعتبار سے اس جدید مملکت کی مخالفت مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت ہی کی طرف سے نہیں ہوگی۔ بلکہ دُنیا کی ہر قوم کی طرف سے ہوگی۔ بنا بریں انہیں اس کا احساس تھا کہ اس مملکت کے قیام اور استحکام کی مخالفت ہر قوم کی طرف سے ہوگی۔ کوئی قوم بھی اسے برداشت نہیں کر سکے گی کہ یہ نظام دُنیا کے کسی خطے میں بھی قائم ہو جائے۔ چنانچہ کلامِ اقبال میں اقوامِ مغرب اور تہذیبِ مغرب کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے (اور اس تکرار و اصرار کے ساتھ کہا گیا ہے) اس سے مقصود قرآنی مسلمانوں کو متنبہ (Warn) کرنا تھا کہ تمہاری اس اسکیم کی مخالفت تمام دُنیا کی طرف سے ہوگی۔

قائداعظمؒ:

اقبالؒ یہ کہتے ہوئے دُنیا سے چلے گئے تو اس کے بعد قائداعظمؒ اس پکار کو لے کر آگے بڑھے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ بتایا کہ اس مملکت میں اندازِ حکومت کس قسم کا ہوگا۔ فرمایا کہ یہ اسلامی مملکت ہوگی اور اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

(انٹرویو حیدرآباد، دکن، شائع شدہ روزنامہ انقلاب، لاہور، مورخہ 8 جنوری 1942ء)

انہوں نے بھی اقبالؒ کے تتبع میں اس امر کی وضاحت کردی کہ اس مملکت میں مذہبی پیشوائیت کا وجود نہیں ہوگا۔ انہوں نے 1938ء میں مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، نوجوانوں سے کہا تھا کہ:

> ''مسلم لیگ نے (کم ازکم) ایک کام تو کر دیا ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے۔۔۔اس نے تمہیں اس ناخوش آئند طبقہ کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرادیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔'' (تقاریر، جلد اوّل، ص:48)

انہوں نے مسلم لیگ کنونشن منعقدہ دہلی (11 اپریل 1946ء) میں واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:

> ''اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے یاد رکھئے! ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔'' (طلوعِ اسلام، ستمبر 1972ء)

انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد فروری 1948ء میں بہ حیثیت گورنر جنرل اہل امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا تھا کہ:

تھیاکریسی نہیں ہوگی:

پاکستان میں کسی قسم کی تھیاکریسی نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔ چونکہ ہمارے ہاں ابھی تک نہ تو تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ مرتب ہوئی ہے اور نہ ہی قائداعظم کی کوئی معیاری سوانح حیات، اس لئے یہ چیز قوم کے سامنے آئی ہی نہیں کہ تحریکِ پاکستان میں متصادم محاذ کون کون سے تھے اور ان میں وجۂ نزاع اور بناء مخالفت کیا تھی۔ یہ متصادم محاذ تھے مذہبی پیشوا اور اقبالؒ اور قائداعظمؒ اور بناء مخاصمت تھی اسلام کا وہ تصور جسے علماء پیش کرتے تھے اور اس کے برعکس وہ

تصور جو اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے پیش نظر تھا۔ یہ جنگ تھی درحقیقت اسلام کے دو تصورات کے درمیان ـــــ ایک وہ اسلام جو کتاب اللہ پر مبنی تھا۔ دوسرا وہ اسلام جو ہمارے دور ملوکیت کا وضع کردہ تھا اور جس کے علمبردار ہمارے علماء تھے، اور ان کے ہم نوا وہاں کے ہندو، ہندو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر قرآنی نظام ان کی دیوار بہ دیوار مملکت (پاکستان) میں قائم ہو گیا تو اس کے انسانیت ساز نتائج کو دیکھ کر وہاں کی (مسلم اور غیر مسلم) آبادی حکومت کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ اس لئے وہ بھی اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ مملکت پاکستان میں اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کا اسلام کارفرما ہو جائے۔ آپ دیکھئے کہ وہاں یہ ہر دو تصورات کس طرح ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ (چونکہ اس جنگ کی ابتداء ہندوستان کی سرزمین سے ہوئی تھی اس لئے ہم اس کا آغاز وہیں سے کرتے ہیں۔ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اقوامِ مغرب نے اس جنگ میں کیا رول ادا کیا ہے اور ابھی تک کر رہی ہیں)۔

علماء کا اسلام:

ہندوستان میں علماء کا مسلک یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کو شخصی قوانین۔ نکاح، طلاق وغیرہ کی آزادی ہو، تو حکومت خواہ سیکولر ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے اسلام کا منشا پورا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ (ان علماء کے سرخیل) مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ:

> ''ایسی جمہوری حکومت جس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سب شامل ہوں، حاصل کرنے کے لئے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہئے۔ ایسی مشترکہ آزادی، اسلام کے اصول کے عین مطابق ہے۔'' (زمزم، 7 جولائی 1938ء)

اس اسلام کے تحفظ کی ضمانت ہندو دیتا تھا۔ مولانا مذکور کے ارشاد کے مطابق:

> ''کانگریس میں ہمیشہ ایسی تجاویز آتی رہتی ہیں اور پاس ہوتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے مذہب اسلام کے تحفظ اور وقار کو ٹھیس نہ لگے۔ (مولانا مدنی کا پمفلٹ، متحدہ قومیت اور اسلام، ص: 61) جسے انہوں نے علامہ اقبالؒ کے جواب میں شائع کیا تھا۔)''

یہ تھا اسلام کا وہ تصور جسے علماء کرام پیش کرتے تھے اور جس کے تحفظ کی ضمانت ہندو دیتا

تھا۔اس کے برعکس داعیان پاکستان کے پیش کردہ اسلام کا تصور یہ تھا کہ اسلام کو اسی صورت میں آزاد تسلیم کیا جا سکتا ہے جب کہ اس کا نفاذ مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت میں ہو۔ اسلام میں مملکت کی بنیاد ہی دین پر استوار ہوتی ہے۔اس تصور کے اسلام کے متعلق ہندو کا ردعمل کیا تھا۔ اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔اوائل 1938ء میں جب مملکت پاکستان کا مقصود و مطلوب اُبھر کر سامنے آ گیا تھا، کانگریس کے (اُس زمانے کے) مشہور لیڈر، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے ایوان اسمبلی میں جس میں وہ کانگریس پارٹی کے لیڈر تھے، قائداعظمؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

''اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔اب وقت آ چکا ہے کہ ہم اعتراف کر لیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں کہ ضمیر، مذہب اور خدا کو اُن کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لا جائے۔اس بات کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔عصر حاضر میں بہترین نظامِ حکومت اس نظریہ پر قائم ہو سکتا ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی، اور سیاسی مفاد کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک قوم بن جائیں۔'' (ہندوستان ٹائمز، 5 ستمبر 1938ء)

اس پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ہندوستان ٹائمز نے لکھا کہ:

''حکومتِ الٰہیہ کا تصور ایک داستانِ پارینہ ہے اور مسلمانوں کا فعلِ عبث ہوگا اگر وہ ہندوستان جیسے ملک میں اس کے احیاء کی کوشش کریں جہاں مختلف جماعتیں ایک دوسرے سے گتھی ہوئی ہیں، یا اس امر کا خیال کریں کہ اس مقصد کے لئے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہ علامت خوش آئند ہے کہ خود مسلمانوں کے ذمہ دار رہنما اس سراب کے پیچھے لگنا نہیں چاہتے۔''

(ہندوستان ٹائمز 14 نومبر 1939ء)

اور خود مسٹر گاندھی نے کہا:

''اگر میں ڈکٹیٹر ہوتا تو مذہب اور حکومت کو الگ الگ کر دیتا۔ مجھے میرے مذہب کی قسم، میں اس کے لئے جان تک دے دیتا۔ مذہب میرا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت کو اس سے کیا واسطہ۔ حکومت کا منصب یہ ہے کہ وہ تمہاری دنیاوی ضروریات کا خیال رکھے۔۔۔ مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ مذہب ہر شخص کا پرائیویٹ معاملہ ہے۔'' (ہریجن، 9 دسمبر 1946ء)

جب مارچ 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی، تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، مسٹر گاندھی نے کہا تھا:

''میں پوری جرأت اور جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناحؒ اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج کل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ بافی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں، ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔'' (ہندوستان ٹائمز، 7 اپریل 1947ء)

اس کے دو ہی ماہ بعد مسٹر گاندھی نے پھر کہا کہ:

''اگر مذہب کو علیٰ حالہ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک نج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق، تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترکہ عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔'' (ہندوستان ٹائمز، 9 جون 1940ء)

یکم نومبر 1941ء کو لدھیانہ میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت

ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے کی۔انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

''تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرز حکومت،قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اُردو اُن کی قومی زبان بن سکے،مختصر یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔'' (ٹریبون،6نومبر 1941ء)

یہ کچھ ہندوؤں نے تحریکِ پاکستان کے دوران کہا۔تقسیم ہند کے بعد بھی یہ شعلہ ان کے سینے میں برابر بھڑکتا رہا کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہوجائے گی۔قائداعظمؒ کی وفات کے بعد وہاں کے مشہور اخبار ہندوستان ٹائمز نے اپنی 19 اکتوبر 1948ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا تھا:

''پاکستان، بالخصوص مشرقی بنگال کی اقلیتوں کو اتنا خوف وہراس اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوا جتنا اس حقیقت سے کہ پاکستان کے رہنماؤں نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان میں اسلامی اصول وروایات کے مطابق ایک اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں۔''

اس کے بعد اس نے (اسی مقالۂ افتتاحیہ میں) کہا کہ:

''اگر کشمیر کا مسئلہ پُرامن طریق سے طے ہوجائے اور پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کردے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوش گوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوجائے گا۔''

اکتوبر 1948ء میں لیاقت علی خان (مرحوم) نے لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے اور ہم نے تہیہ کرلیا

ہے کہ وہ ان اصولوں پر قائم کی جائے گی جو ہمیں اسلام نے سکھائے ہیں۔

(ہندوستان ٹائمز 25 اکتوبر 1948ء)

اس پر اسی اخبار نے اپنی 28 اکتوبر کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا کہ:

''تقسیم ہند کے وقت سے ہندوستان کے نیتاؤں نے اس امر کا اعلان کر رکھا ہے کہ ہندوستان میں سیکولر حکومت ہوگی لیکن سرحد کے اس پار کے لیڈر پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اسلامی اسٹیٹ ہوگا۔۔۔ چنانچہ ابھی پچھلے دنوں مسٹر لیاقت علی خان نے کہا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے۔''

آپ نے دیکھا کہ ہندو، اُس اسلام کے تو تحفظ کی ضمانت دیتا تھا جسے علماء پیش کرتے تھے لیکن اس اسلام کے تصور تک سے اس کے سینے پر سانپ لوٹتے تھے جس کے نفاذ کے لئے مملکت پاکستان (کا پہلے مطالبہ کیا گیا تھا اور بعد میں یہ) وجود میں آ گئی تھی۔ اس قسم کی مملکت کی مخالفت میں ہندو کس حد تک جانے کی سوچ رہا تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب تقسیم ہند کا فیصلہ ہو گیا تو کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو ایک طرف اس فیصلہ پر دستخط کر رہے تھے اور دوسری طرف اپنی قوم سے کہہ رہے تھے کہ:

''ہماری سکیم یہ ہے کہ ہم اس وقت مسٹر جناح کو پاکستان بنا لینے دیں اور اس کے بعد معاشی طور پر یا دیگر انداز سے ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن سے مجبور ہو کر مسلمان گھٹنوں کے بل جھک کر ہم سے درخواست کریں کہ ہمیں پھر سے ہندوستان میں مدغم کر لیجئے۔''

(Pakistan Faces India....P.99)

اسے پھر ذہن میں رکھئے کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ہندو کو مسلمانوں کی ایک الگ مملکت بنانے پر کوئی خاص اعتراض'' نہیں تھا۔ انہیں اعتراض تھا تو اس پر کہ وہ مملکت (اقبال اور جناح کے تصور کے) اسلام کے نفاذ کا ذریعہ ہوگی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ 1965ء کی جنگ میں عبرت آموز شکست کھانے کے بعد، اُس زمانے کے (ہندوستان کے) وزیر دفاع

مسٹر چوّن نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ:

''پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں اور یہ اختلاف اور دشمنی مہینے یا ہفتے بھر کی نہیں، بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس کے لئے ایک تازہ اور فیصلہ کُن جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔''

1971ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد بھارت نے بہت بڑا جشن منایا تھا اور وہاں کی پارلیمان نے اس کامیابی پر مسز گاندھی کی خدمت میں ہدیہ مبارکباد پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں مسز گاندھی نے جو کچھ کہا تھا وہ ہندو ذہنیت کی پوری پوری غمازی کرتا ہے۔ اُس نے کہا تھا۔

''یہ کامیابی، نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی۔ یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریک پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے، یہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب پچیس سال کے تجربہ نے بتا دیا ہے کہ جو کچھ ہم کہتے تھے وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔''

(یہ مسٹر گاندھی کے بقول) باطل نظریہ کیا تھا؟ یہی کہ مملکت کی بنیاد (اقبالؒ اور جناحؒ کے تصور کے) اسلام پر رکھی جائے گی۔

مرحوم مودودی صاحب کی طرف سے مخالفت:

مطالبۂ پاکستان کی سب سے زیادہ شدید مخالفت سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں گذشتہ تیس پینتس سال میں اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ (طلوعِ اسلام نے تو بلکہ 1940ء میں ان کی مخالفت کی تھی۔) ان کا اندازِ مخالفت، نیشنلسٹ علماء سے مختلف تھا لیکن اقبالؒ اور جناحؒ کے پیش کردہ

اسلام کو وہ بھی ''کافرانہ'' قرار دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی مشہور تالیف مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، حصہ سوم میں لکھا تھا:

''جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام رائج ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی۔ اُن کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو گا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ قابل لعنت۔''

(ص:131،132)

انہوں نے اپنی مخالفت، تقسیمِ ہند کے زمانے تک برابر جاری رکھی۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپریل 1947ء میں (جب تقسیمِ ہند کا اصولی فیصلہ ہو چکا تھا) ٹانک۔ مدراس اور پٹنہ میں اپنی جماعت کے خصوصی اجلاس منعقد کئے تا کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان کے خلاف بھڑکایا جائے، چنانچہ انہوں نے اس وقت بھی تحریکِ پاکستان کو ''غیر اسلامی'' قرار دیا اور (ان کے ایک رفیق کار) ملک نصر اللہ خان عزیز (مرحوم) نے یہاں تک کہہ دیا کہ:

''بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اقامتِ دین کے آغاز سے پہلے زمین کا ایک قطعہ حاصل کر لینا ضروری ہے جہاں دین کو برپا کر سکیں۔ حیرت ہے کہ یہ چیز خاصے سمجھدار اور بظاہر معقول اور عالمِ دین لوگوں تک کی طرف سے کہی جاتی ہے۔ ایسی باتیں وہی لوگ کہہ سکتے ہیں۔ جو یا تو سیاست اور فلسفۂ اجتماع سے کلیتہً نابلد ہیں اور محض اِدھر اُدھر سے چند باتیں اور نعرے سُن سنا کر سیاسی تحریکوں میں شامل ہو گئے ہیں اور کوئی سمجھدار آدمی موجود نہ ہونے کی وجہ سے لیڈری کے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ یا پھر نفس پرستی میں مبتلا اور خوفِ خدا سے آزاد ہونے کی وجہ سے اَن پڑھ اور حقائق و سیاست سے ناواقف عوام کو بے وقوف بناتے ہیں تا کہ وہ ان کے چنگل سے نکلنے نہ پائیں۔ ورنہ موٹی بات ہے کہ حکومت کے قیام کے لئے آپ کو اینٹ اور گارے کی ضرورت نہیں کہ آپ قطعات زمین تاکتے پھریں۔ اس کے

لئے آپ کو زمین کی نہیں بلکہ ایسی مضبوط اور منظّم جماعت کی ضرورت ہے جو آپ کے پیشِ نظر نظریہ حکومت کو ماننے اور اس کے لئے مر مٹنے والی ہو۔ اگر آپ نے ایسی جماعت پیدا کر لی تو جہاں بھی وہ ہوگی وہیں وہ اس نظریہ کی حکومت قائم کر لے گی۔'' (روئداد جماعت اسلامی، حصہ پنجم، ص:65؛ص:154)

یعنی ان کے نزدیک بھی، اسلام کے نفاذ کے لئے الگ خطۂ زمین کی ضرورت نہیں تھی۔ یہی بات نیشنلسٹ علماء کہتے تھے اور ہندو بھی یہی چاہتا تھا۔

آپ نے دیکھا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران بنیادی وجۂ نزاع کیا تھی؟ یہ درحقیقت اسلام کے دو تصورات کا ٹکراؤ تھا۔ اسلام کا ایک تصور یہ تھا کہ حکومت کسی قسم کی بھی ہو اس میں اسلام پر عمل ہوسکتا ہے۔ دوسرا تصور یہ تھا کہ اس کے لئے الگ آزاد مملکت کا قیام لاینفک ہے۔ جس میں حکومت قرآنی خطوط پر متشکل ہو۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد:

ہندوؤں اور مسلمانوں کی ان مذہب پرست جماعتوں کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان کے لئے ایک قطعۂ زمین حاصل ہوگیا۔ یہ ان کی شکست تھی لیکن انہوں نے اس شکست کو فتح سے بدلنے کے لئے مختلف تدابیر سوچ لیں۔ (جیسا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے اعلان کیا تھا) ہندو حکومت کے یہ ارادے تھے کہ سیاسی اور عسکری سطح پر ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن سے مملکت پاکستان کا (خاکم بدہن) وجود ہی باقی نہ رہے۔ لیکن مذہب پرست جماعتوں نے یہ ارادہ کیا کہ یہ جداگانہ مملکت قائم رہتی ہے تو رہے، لیکن اس میں اقبالؔ اور جناحؒ کے تصور کا اسلام نافذ نہ ہونے پائے۔ اسلام وہی نافذ ہو جس کے علمبردار علماء حضرات ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری تھا کہ یہ تمام جماعتیں پاکستان آ جائیں اور یہاں اپنے تصور کے نفاذ کی کوشش کریں۔ چنانچہ تشکیلِ پاکستان کے ساتھ ہی یہ سب ہجوم کر کے اِدھر آ گئے۔ ہندوستان سے پاکستان کی طرف آنے والے مسلمان عوام بیچارے تو لاکھوں کی تعداد میں قتل ہو گئے۔ ان کے قافلے لوٹے گئے۔ ان کی عصمتیں برباد ہوگئیں۔ یہ تباہ اور برباد ہو گئے۔ لیکن مذہب کے

علمبردار حضرات امن وامان سے بحفاظت اِدھر منتقل ہو گئے۔

اقوامِ مغرب کی طرف سے مخالفت:

ہم نے شروع میں کہا ہے کہ حقیقی اسلام کے نفاذ سے ہندو ہی لرزاں وترساں نہیں تھا۔ مغرب کی سرمایہ پرست اور سیکولر نظام کی حامی اقوام بھی اس سے خائف تھیں۔ اس لئے ان کی بھی یہی کوشش تھی کہ (اوّل تو پاکستان بنے ہی نہ، اور اگر یہ بن بھی جائے تو یہاں) اقبالؔ اور جناحؔ کے تصور کا حقیقی اسلام نافذ نہ ہونے پائے۔ اقبالؔ نے جب پاکستان کا تصور دیا تھا تو اس کی نگۂ بصیرت نے اس خطرے کو بھی بھانپ لیا تھا۔ ان کی آخری تصنیف ''ارمغانِ حجاز'' میں ایک نہایت شگفتہ اور بلیغ نظم ہے جس کا عنوان ہے۔ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ اس میں انہوں نے بڑے دلکش محاکاتی (ڈرامائی) انداز میں، ان اقوام کے اس خطرہ کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کے ازالہ کے لئے انہوں نے کیا سوچا ہے۔ انداز اس نظم کا یہ ہے کہ ابلیس اپنی کابینہ کی میٹنگ منعقد کرتا ہے جس میں ہر شعبے کا مشیر اپنی اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کرتا ہے کہ اس نے مختلف اقوام کو ابلیسی راستوں پر ڈالنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ صدرِ مجلس، ابلیس، ان رپورٹوں کو بڑی توجہ سے سنتا ہے اور آخر میں کہتا ہے کہ تم نے جن تحریکوں کو ابلیسی پروگرام کے راستے کی رکاوٹ بتایا ہے مجھے ان میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا۔ ان کے برعکس ۔

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

تم نے سب سے زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ کمیونزم میں ہمیں بڑا خطرہ دکھائی دیتا ہے۔ لیکن تمہاری نگاہ حوادثِ عالم کی سطح پر ہے اور

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

جب ابلیسؔ نے کہا تھا کہ اسے درحقیقت خطرہ اُمتِ مسلمہ سے ہے تو اس کے مشیروں میں کچھ چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اس پر اس نے کہا کہ تمہارے دل میں جو شکوک اُبھر رہے

ہیں، مجھے ان کا احساس ہے۔

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں مَیں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں

میں یہ سب جانتا ہوں:

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں

وہ شرعِ پیغمبر ﷺ۔ یعنی قرآنی نظام، جس کی خصوصیات یہ ہے کہ:

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ ''آئیں'' تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں

اسے اچھی طرح یاد رکھو کہ تمہارے لئے کرنے کا کام ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ ۔

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!

انہوں نے کہا کہ اس کے لئے کرنا کیا چاہئے؟ اس نے کہا کہ یہ قوم بڑی مذہب پرست واقع ہوئی ہے، اس لئے اس سے مذہب کا چھڑا دینا مشکل ہے۔ قرآن ان کے ہر گھر میں ہوتا ہے۔ انہیں کھلے بندوں اس سے بیگانہ نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کے لئے بڑے پُرفریب حربہ کی ضرورت ہوگی، اور وہ یہ کہ ان میں نظری مسائل کی بحثیں چھیڑ دو:

ہے یہی بہتر الٰہیّات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

اوراس طرح:

تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مُہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

پھرسُن رکھوکہ:

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اس خطرہ سے محفوظ و مامون رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ ترکر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اس سے مراد صرف تصوف کی خانقاہیت نہیں۔ وہ مذہب بھی ہے جس کی علمبردار ہماری مذہبی پیشوائیت ہے۔

علامہ اقبالؔ نے پاکستان کا تصور دینے کے ساتھ ہی اس خطرہ سے بھی آگاہ کر دیا جو اُسے پیش آنے والا تھا۔ یعنی نظام سرمایہ داری کی حامل اقوام مغرب (جنہیں بغرض تعارف امریکن بلاک کہا جاتا ہے)۔ کی طرف سے اس کی مخالفت۔ اس بلاک کی ابلیسیت کا یہ عالم ہے کہ خود ابلیس نے بحضور رب العزت درخواست کی تھی کہ مجھے اب رٹیائر کر دیجئے، کیونکہ

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

اس بلاک کے پیش نظر دو مقصد تھے۔ ایک کمیونزم کے سیلاب کی روک تھام اور دوسرے

پاکستان میں اس اسلامی نظام کو قائم نہ ہونے دینا، جس کی خاطر اسے حاصل کیا گیا تھا اور جس میں اس بلاک کو اپنی موت نظر آتی تھی۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کی مذہبی پیشوائیت کو اپنا آلۂ کار بنانا ضروری تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ روس کے بڑھتے ہوئے خطرہ کی روک تھام کے لئے امریکہ نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ

''دنیا کے خدا پرستو! آؤ ہم متحد ہو کر اس الحاد اور بے دینی کا مقابلہ کریں۔''

جب 1976ء میں پاکستان میں سیرت کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں یونیورسٹی آف ایڈنبرا کے شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر ڈبلیو، منٹگمری، واٹ، بھی شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے 6 مارچ 1976ء کو اپنے خطاب کے دوران کہا تھا کہ اس وقت نوعِ انسانی اخلاقی اور ثقافتی سطح پر ایک نہایت نازک صورتِ حال سے دو چار ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے فرزندانِ توحید کی طرف سے زیادہ سے زیادہ تبلیغ میسر آسکے تاکہ عیسائی اور مسلمان اپنے مشترکہ دشمن ''الحاد'' کے خلاف مل کر جہاد کرسکیں۔

(نوائے وقت، لاہور، مورخہ 7 مارچ 1976ء)

اس ''زیادہ سے زیادہ تبلیغ'' کے لئے اس بلاک نے کیا کچھ کیا اس کے متعلق ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے جہاں فنڈامینٹل ازم کی تحریک کا ذکر آئے گا۔ سردست آپ ''الحاد وبے دینی کے خلاف جہاد'' کو دیکھئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ الحاد اور بیدینی کی مخالفت مسلمانوں کا فریضہ ہے لیکن قرآن تو روس کے انکارِ خدا اور اقوامِ مغرب کے اقرارِ خدا دونوں کو یکساں قرار دیتا ہے، اور دونوں سے اُس خدا پر ایمان کا مطالبہ کرتا ہے جس کا تصور قرآن نے پیش کیا ہے۔ لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس میں فرق کیا اور روس کی لادینی کی مخالفت کو اپنا دینی فریضہ قرار دے لیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جس قدر یہ جہاد زور پکڑتا گیا، مغربی بلاک کا نظامِ سرمایہ داری اس نسبت سے مستحکم ہوتا گیا۔ یہ اس بلاک کا پہلا مقصد تھا۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ پاکستان میں اس اسلام کا نفاذ نہ ہونے پائے جس کے لئے اسے حاصل کیا گیا

تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مذہبی جماعتوں کا تعاون ضروری تھا۔ اس سلسلہ میں (کالعدم) جماعت اسلامی کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔اس زمانے میں تو اس قسم کی خبروں کو کسی نے چنداں درخور اعتنانہ سمجھا لیکن اب جو ماضی کے ان واقعات پر نگہ بازگشت ڈالتے ہیں تو نظر آجاتا ہے کہ اس جماعت کے امریکن بلاک کے ساتھ شروع ہی سے روابط قائم تھے۔(مثلاً) روزنامہ امروز (لاہور) کی یکم دسمبر 1952ء کی اشاعت میں یہ خبر درج تھی کہ:

''امریکن سفارت خانہ کے پروفیسر ڈاکٹر ویلر نے گورنمنٹ کالج میانوالی کے طلباء کو لیکچر دیئے جن میں کمیونزم کی مخالفت تھی۔ان کے ساتھ جماعت اسلامی، لاہور کے راہنما بھی آئے تھے اور مقامی امیر مولانا گلزار احمد تھے۔''

(بحوالہ امروز، مورخہ یکم دسمبر 1976ء)

یہ 1952ء کا ذکر ہے۔1955ء میں حکومت پاکستان نے امریکہ کے ساتھ اپنے روابط مستحکم کرنے کا فیصلہ کیا تو (مرحوم) مودودی صاحب نے لاہور اور کراچی میں پبلک جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے، کھلے الفاظ میں کہا:

''اگر یہ (امریکن) بلاک فی الواقعہ چاہتا ہے کہ کمیونزم کی روک تھام کے لئے اسے مسلم عوام کا دلی تعاون حاصل ہو تو اسے اپنی بنیادی پالیسی میں بنیادی تغیر کرنا پڑے گا۔اسے یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ اسے مسلم بلاک کے حکمرانوں سے ساز باز کرنا ہے یا مسلم ممالک کے عوام کا تعاون حاصل کرنا ہے۔یہ اس کے سوچنے کا کام ہے کہ اسے کونسی راہ اختیار کرنی چاہئے۔اسے حکمرانوں کی ضرورت ہے جو عوام پر سطحی اثر بھی نہیں رکھتے یا عوام کے تعاون کی ضرورت ہے جو طاقت کا اصلی سرچشمہ ہوتے ہیں۔۔۔مسلمان ملکوں کے ساتھ آپ کی جو پالیسی اب تک چلی آرہی ہے وہ ایسی ہرگز نہیں ہے کہ پاکستان اور دوسرے ممالک کے عوام کا دلی تعاون آپ کو حاصل ہو۔

(جماعت اسلامی کا ترجمان اخبار تسنیم بابت، 16و20دسمبر 1955ء)

ظاہر ہے کے اس بلاک کو مسلم عوام کا تعاون ان کے نمائندوں کے ذریعے ہی حاصل

ہوسکتا تھا۔

ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ روابط قائم ہوئے یا نہیں اور اگر قائم ہوئے تو ان کی نوعیت کیا تھی، البتہ یہاں اس قسم کی چہ میگوئیاں ہوتی رہیں کہ امریکہ کی طرف سے یہاں کی مذہبی جماعتوں کو مالی امداد ملتی ہے۔ حتیٰ کہ (اُس زمانہ کی) نیشنل عوامی پارٹی کے جائنٹ سیکرٹری محی الدین احمد صاحب نے ڈھاکہ کے ایک پبلک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ''جماعت اسلامی'' کو سی۔ آئی۔ اے کی طرف سے حال ہی میں ساٹھ لاکھ روپیہ ملا ہے اور اس سے پہلے وہ غلافِ کعبہ تیار کرانے کے بہانے۔۔۔ پچیس لاکھ روپیہ ہضم کر گئی ہے۔ (بحوالہ روزنامہ امروز، مورخہ 14 مئی 1967ء)۔ اسی سلسلہ میں مؤقر جریدہ ''چٹان'' لاہور نے اپنی 15 مئی 1967ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا:

> ''غیر ملکی حکومت سے گفتگو کرنے اور اس کے ساتھ روابط پیدا کرنے کا حق صرف اس ملک کی حکومت کو ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کی کوئی جماعت اپنے طور پر یہ اقدام کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کی نہیں، بلکہ کسی اور ملک کی گماشتہ ہے۔''

اسلام نافذ کرو کا نعرہ:

ہم اس سوال کے سیاسی گوشے سے قطع نظر کرتے ہوئے، اس گوشے کی طرف آتے ہیں کہ جن مذہبی جماعتوں نے مطالبۂ پاکستان کی اس قدر مخالفت کی تھی انہوں نے یہاں ''اسلام نافذ کرنے'' کے سلسلہ میں کیا کیا۔ انہوں نے یہاں آتے ہی یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس لئے یہاں سب سے پہلا کام اسلام کے نفاذ کا ہونا چاہئے۔ اور یہ کام ہم ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ ان سے کسی نے نہ پوچھا کہ آپ یہاں کون سا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ وہ اسلام جس کا تصور اقبالؒ اور قائداعظمؒ نے پیش کیا تھا، یا وہ اسلام جسے آپ پیش کرتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ انہوں نے وہی اسلام نافذ کرنا تھا، جسے یہ وہاں پیش کرتے تھے اور جس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کا جواز ہی باقی نہیں رہتا تھا۔ انہوں نے

جب اپنے مطالبہ پر زیادہ زور دیا تو اعتراض یہ ہوا کہ آپ میں تو اس قدر فرقے ہیں جن میں اس قدر باہمی اختلاف ہے، اس لئے یہاں کون سا اسلام نافذ کیا جائے! اگر آپ کوئی متفق علیہ فارمولا متعین کرسکیں تو اس باب میں پیش رفت ہوسکے۔ اس اعتراض کے جواب میں انہوں نے 1951ء میں مختلف فرقوں کے نمائندگان پر مشتمل (31) علماء کی کانفرنس منعقد کی جس میں قانون سازی کے سلسلہ میں حسب ذیل فارمولا پیش کیا گیا:

(1) پرسنل لاز، ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے۔ اور

(2) ملک کے قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب کئے جائیں گے۔

یہ بہت بڑا مقدس فریب تھا جو قوم کو دیا گیا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ ملکی قوانین کا کوئی ضابطہ مرتب ہو ہی نہ سکے۔ تفصیل اس اجمال کی بڑی معنی خیز ہے۔ جہاں تک ''کتاب'' کا تعلق ہے، اس سے مراد قرآن مجید ہے جو سب فرقوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ لیکن سنت کی یہ کیفیت نہیں۔ یہی نہیں کہ ہر فرقہ کی سنت الگ الگ ہے۔ سنت کہتے کسے ہیں، اس میں بھی ان کا اختلاف ہے اور شدید اختلاف کانفرنس میں پاس کردہ فارمولا (کتاب وسنت) پر دستخط کرنے والوں میں، سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) اور مولانا محمد اسماعیل سلفی (مرحوم) صدر مرکزی جماعت اہل حدیث، سرفہرست تھے۔ سنت کی (Definition) کے متعلق ان میں جو بحث چلی، وہ مولانا مرحوم کی طرف سے شائع کردہ کتاب ''جماعتِ اسلامی کا نظریہ حدیث'' میں بالتفصیل درج ہے۔ اس کے نمایاں اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔ اہل حدیث حضرات کے نزدیک جس کے نمائندہ مولانا سلفی (مرحوم) تھے۔ صحیح احادیث میں جو کچھ آیا ہے، وہ سب کا سب سنت ہے۔ اس کے برعکس مودودی صاحب (مرحوم) کے نزدیک:

مودودی صاحب کے نزدیک سنت:

''سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں۔ جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی ﷺ نے بہ حیثیت ایک انسان ہونے کے، یا بحیثیت ایک ایسا

شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق اور امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کونسا جز وسنت ہے اور کونسا جز وعادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو۔۔۔تمدن ومعاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی ﷺ تشریف لائے تھے اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبی ﷺ نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضور ﷺ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں۔ کچھ اس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوئے تھے اور کچھ اس زمانے کے حالات پر جن میں آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنادینا مقصود نہ تھا۔"

(رسائل ومسائل، حصہ اوّل، ص:311، 317)

اسی کتاب میں وہ ص:314 پر لکھتے ہیں:

بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضور ﷺ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرز معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا نہ اس کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جاسکتا ہے کہ حدیث کی رُو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبی ﷺ پہنتے تھے اور نہ شرائع الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم ورواج کو دُنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنادیں، سنت کی اس مخصوص تعریف کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو چیزیں اصطلاحِ شرعی میں سنت نہیں ہیں ان کو خواہ مخواہ سنت قرار دے دینا منجملہ ان بدعات کے ہے جن سے نظام دینی میں تحریف واقع ہوتی ہے۔

یعنی اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک صحیح حدیث میں جو کچھ آیا ہے وہ سب کا سب سنت

رسول اللہ ﷺ کے دائرے میں شامل ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ لیکن مودودی صاحب کے نزدیک صحیح احادیث میں سے وہ باتیں سنت کے دائرے میں داخل نہیں جنہیں نبی اکرم ﷺ نے اپنی بشری حیثیت سے عادتاً اختیار کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان باتوں کو بھی سنت قرار دے تو اس کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد تھا کہ:

میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔ (ایضاً، ص:308)

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں:

''جو امور آپ ﷺ نے عادتاً کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کرلیں، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا ہرگز یہ منشاء نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔'' (ایضاص:300)

اس پر اعتراض یہ وارد ہوا کہ احادیث کے مجموعوں میں تو اس کی تصریح کہیں درج نہیں کہ حضور ﷺ نے فلاں بات بہ حیثیت رسول ﷺ فرمائی (یا کی) تھی اور فلاں بات بشری حیثیت سے۔ تو (مودودی صاحب کے اصول کے مطابق) سنت کو متعین کیسے کیا جائے گا۔ اسے کون متعین کرے گا اور اس کے سنت ہونے کی سند کیا ہوگی؟ اس کے جواب میں مودودی (مرحوم) نے کہا کہ ایسے معاملات کا فیصلہ سند اور دلیل کی رُو سے نہیں ہوا کرتا۔ اس کا فیصلہ وہ شخص کرسکتا ہے:

جس نے حدیث کے بیشتر ذخیرہ کا گہرا مطالعہ کر کے احادیث کو پرکھنے کی نظر بہم پہنچائی ہو۔ کثرت مطالعہ اور ممارست سے انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے جس سے وہ رسول اللہ ﷺ کا مزاج شناس ہوجاتا ہے۔۔۔اس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پُرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جوہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔۔۔اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد وہ اسناد

کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت کو دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السنہ مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس جامِ زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے، وہ اسے طبیعتِ اسلام اور مزاجِ نبوی ﷺ کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات، حصہ اوّل، ص:302، ص:324)

مولانا اسماعیل (مرحوم) نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

اگر ایک جماعت اپنی عقیدت مندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول ﷺ کا مزاج شناس تصور کر لے۔ پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے جسے چاہے رد کر دے، یا کوئی عالم یا قائد بلاوجہ کسی موضوع یا مختلق، مرسل یا منقطع حدیث کے متعلق یہ دعویٰ کر دے کہ میں نے اس میں ''ہیرے کی جوت'' دیکھ لی ہے۔ تو یہ مضحکہ انگیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم ان شاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسول ﷺ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث، ص:63)

ظاہر ہے کہ جب سنت کی (Definition) میں اختلاف کا یہ عالم ہے۔ تو سنت کا وہ مجموعہ کہاں سے مل سکے گا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر سنت تسلیم کرتے ہوں۔ ان حالات میں آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ 1951ء میں (31) علماء نے جو متفق علیہ مطالبہ پیش کیا تھا (کہ ملکی قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب ہوں) وہ کہاں تک قابل عمل تھا؟ اس کے باوجود، یہ حضرات (مودودی مرحوم سمیت) بیس سال تک یہ مطالبہ پیش کرتے رہے کہ پاکستان میں اسلامی قوانین کتاب وسنت کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ تا آنکہ 1970ء میں خود

مودودی مرحوم کو اعلان کرنا پڑا:

کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاز کے معاملہ میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔

(جماعت اسلامی کا ترجمان، ایشیاء، 23 اگست 1970ء)

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال اُبھرا ہوگا کہ جب مودودی (مرحوم) نے محسوس کیا کہ یہ سنت کے پیدا کردہ اختلافات ہیں جن کی وجہ سے ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا، تو انہوں نے تجویز کیا ہوگا کہ قانون سازی کا مدار قرآن کو قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں، لیکن توبہ کیجئے، وہ ایسا کس طرح کر سکتے تھے؟ قرآن کے تو نام سے ان حضرات کو چڑ ہے کیونکہ اس سے ان کا رچایا ہوا سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کو قرآن کے نام سے کس قدر چڑ ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔ دو سال اُدھر کی بات ہے، سعودی عرب نے اپنے ہاں ایک نیا دستور رائج کرنے کا فیصلہ کیا اس کے مسودہ پر تبصرہ کرتے ہوئے، جماعت اسلامی کے ترجمان ایشیاء نے اپنی 13 اپریل 1980ء کی اشاعت کے اداریہ میں لکھا:

"ایک اور بات کی جانب بھی ہم توجہ دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔۔۔ خبر ہے کہ شہزادہ نائف نے کہا ہے کہ سعودی عرب کا آئین قرآنِ کریم ہوگا۔ بلاشبہ اس سے ان کا تصورِ قرآن، حدیث سے منقطع نہیں ہے۔ لیکن زیادہ مناسب ہوگا کہ سعودی عرب کا جو بھی دستور بنے اس میں کتاب کے ساتھ سنت کا لفظ ضرور موجود ہو۔"

مقصد اس سے یہی تھا کہ اسلامی مملکت کی جس اسکیم کو ہم یہاں ناکام بنا چکے ہیں۔ وہ کہیں سعودی عرب میں کامیاب نہ ہو جائے۔

بہرحال جب مودودی (مرحوم) نے کہا کہ کتاب وسنت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا تو ان سے پوچھا گیا کہ پھر پاکستان میں اسلامی قوانین کے سلسلہ میں کیا کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ یہاں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔ یعنی وہ فقہ جس کے متعلق ان

کے اپنے نظریات یہ تھے:

1۔ مجتہد خواہ کتنا ہی با کمال ہو، زمان ومکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا۔ نہ اُس کی نظر تمام ازمنہ واحوال پر وسیع ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں میں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔

(تفہیمات، حصہ دوم، ایڈیشن 1951ء، ص:426)

2۔ یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔ (ایضاً)

3۔ بزرگانِ سلف کے اجتہادات نہ تو اٹل قانون قرار دیئے جاسکتے ہیں اور نہ سب کے سب دریا برد کردینے کے لائق ہیں۔ صحیح اور معتدل مسلک یہی ہے کہ ان میں ردوبدل کیا جاسکتا ہے۔

(رسائل ومسائل، جلد دوم، ایڈیشن، ستمبر 1964ء، ص:282)

4۔ دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن، محرم 1360ھ)

5۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ اور جب میرا ان کے بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور وفکر کرکے رائے قائم کرتا ہوں۔

6۔ میں نہ مسلکِ اہلِ حدیث کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں اور نہ حنفیت یا شافعیت ہی کا پابند ہوں۔

(رسائل ومسائل، حصہ اوّل، ستمبر 1951ء، ایڈیشن، ص:235)

7۔ میرے نزدیک صاحبِ علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ، بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (ایضاً، ص:244)

8۔ ایک صاحبِ عقل انسان کے لئے اس سے زیادہ شرمناک بات کیا ہوسکتی ہے

کہ وہ کسی عقیدہ کا معتقد ہو اور اس اعتقاد کے حق میں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی دلیل نہ ہو کہ اس کے باپ دادا بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے۔۔۔کسی چیز کے صحیح یا برحق ہونے کے لئے یہ کوئی دلیل ہی نہیں کہ بزرگوں سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔

(تنقیحات، پانچواں ایڈیشن، ص:150، 151)

9۔ انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کر کے اجتہاد کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (ایضاً، ص:130)

فقہ کے متعلق مودودی صاحب مرحوم کے ان نظریات کے ساتھ اُن کے اس مطالبہ کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔

فقہ حنفی کو حنفی (سُنی) فرقہ کے سوا کوئی فرقہ بھی من وعن اسلامی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب سے عدم دلچسپی کی انتہا ہے کہ جب مودودی مرحوم نے یہ تجویز کیا کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے تو کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ آپ نے کتاب وسنت کے فارمولا کو اس لئے مسترد قرار دے دیا تھا کہ اس کی رُو سے کوئی ضابطہ قوانین ایسا مرتب نہیں ہو سکے گا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں، تو جو ضابطۂ قوانین فقہ حنفی کے مطابق مرتب ہوگا، کیا اُسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں گے؟ کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا، حتیٰ کہ ان مذہبی فرقوں نے بھی، جو چھوٹے چھوٹے (فروعی) مسائل کے اختلاف پر حنفیوں سے اُلجھتے رہتے ہیں اور ان کے اختلافی جھگڑے پولیس اور عدالتوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور تعجب بالائے تعجب یہ کہ خود حکومت نے بھی اس سوال کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور فقہ حنفی کو قانون سازی کا مدار تسلیم کر لیا، اس بے اعتنائی کا نتیجہ جلد ہی سامنے آ گیا۔ جب زکوٰۃ سے متعلق قانون پبلک لاء کی حیثیت سے نافذ کیا گیا تو شیعہ حضرات کی طرف سے اس کے خلاف ایسا شدید عملی احتجاج ہوا کہ حکومت کو یہ قانون بدلنا پڑا اور ہر فرقہ کو اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کرے۔ (قرآنی فقہ کے مطابق

عمل کرنے کی البتہ اجازت نہیں دی گئی) یہ حشر ہوا پہلے ہی پبلک لاء کا۔ جہاں تک سزاؤں (حدود) سے متعلق نافذ کردہ قوانین کا تعلق ہے خود صدرِ مملکت نے ایک سے زیادہ بار اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ ناممکن العمل ہیں۔ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے چند ہی روز بعد صدر مملکت (ضیاء الحق) نے امریکہ کی (C.B.S) کی ٹی وی ٹیم کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں (ان کے اس اعتراض کے جواب میں کہ یہ سزائیں بڑی وحشت ناک ہیں) کہا تھا کہ:

> یہ ٹھیک ہے لیکن میں اس کی وضاحت اس طرح کروں گا۔ اسلام سزا کے بجائے تخویف پر زور دیتا ہے۔ اگر آپ اس فلسفہ پر نگاہ رکھیں گے جو ان سنگین سزاؤں کے پیچھے کارفرما ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اُس قانونِ شہادت کی رُو سے جس کا نفاذ کیا جارہا ہے، ایک فی ہزار مجرموں کو بھی سزائیں نہیں دی جاسکیں گی۔
>
> (پاکستان ٹائمز، 19 فروری 1979ء)

صدرِ مملکت نے، اواخر نومبر 1981ء میں، ہانگ کانگ سے شائع ہونے والے میگزین ایشیاء ویک (Asia week) کو انٹرویو دیا جس میں انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں شرعی حدود کے متعلق قوانین تو نافذ کردیئے گئے ہیں لیکن ان کے مطابق کسی کو سزا نہیں مل رہی۔ فرمایا کہ:

> یہ ٹھیک ہے۔ ایسا نہیں کیا جاتا۔ آپ لوگوں کو سنگسار نہیں کرسکتے۔ قرآنی قانون کا فلسفہ یہ ہے کہ تمہارے ہاں ایسی قوت ہونی چاہیئے جو لوگوں کو ارتکابِ جرم سے باز رکھ سکے۔ ذرا سوچو کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے چار گواہ مل سکیں جو شہادت دیں کہ انہوں نے جنسی اختلاط کے وقت عمل دخول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟ ایسا ناممکن (Impossible) ہے۔ (ایشیاء ویک، بابت 4 دسمبر 1981ء)

آپ نے غور فرمایا کہ یہاں اسلام کو کس طرح ایک عضو معطل بنا کر رکھ دیا گیا ہے؟ اس کے باوجود چرچا کیا جارہا ہے کہ پاکستان میں اسلام کا احیاء ہو رہا ہے۔ پاکستان کے مخالفین (اور اقبال کی نگہ دوررس کے مطابق) اقوامِ مغرب دونوں کا یہی منشاء تھا۔

نظامِ سرمایہ داری:

ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مغرب کی نظامِ سرمایہ داری کی علمبردار قوتوں نے ''خدا پرستوں'' (یعنی مسلم اقوام) کو جو دعوتِ اتحاد وتعاون دی تھی تو اس سے کمیونزم کے سیلاب کے سامنے بند باندھنا مقصود تھا۔ مودودی مرحوم نے اسی لئے ان سے کہا تھا کہ تمہارا یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ تم مسلم ممالک کے حکمرانوں کے بجائے یہاں کے عوام سے رابطہ قائم کرو۔ یہ رابطہ کس طرح قائم ہوا اس کی تفصیل میں جانے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ لیکن مودودی (مرحوم) نے اسلام کا جو معاشی نظام پیش کیا وہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ انہوں نے نظامِ سرمایہ داری کو عین مطابق اسلام ثابت کرنے کے لئے کس قدر کوشش کی۔ اس نظام کو انہوں نے اپنی کتاب ''مسئلہ ملکیتِ زمین'' میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس کے دو ایک اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔ وہ اس میں لکھتے ہیں:

''اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق وواجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حدونہایت رکھی جاسکتی ہیں۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اس کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کر دیا جائے۔''

(مسئلہ ملکیتِ زمین، پہلا ایڈیشن، 1950ء، ص:52،53)

آگے چل کر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''آخری چیز جو مسلمان مصلحین کی نگاہ میں رہنی ضروری ہے یہ ہے کہ اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے

دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر دینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو اور جس طرح اس نے دُنیا کے کسی دوسرے معاملہ میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی ہے کہ تم کسی ایسے کام پر حقوقِ ملکیت نہیں رکھ سکتے ہو جس کو تم اُجرت پر یا شرکت کے طریقے پر دوسروں کے ذریعے سے کر رہے ہو، اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اُجرت یا شراکت پر کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوقِ ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کر سکتے ہیں۔ مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں، وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔''

(ایضاً، ص:72،73)

یہی نظام اس وقت یہاں رائج ہے جسے اسلامی کہنے کے لئے فقہ کی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ دولت کا انبار در انبار جمع کرنا عین مطابقِ اسلام ہے بشرطیکہ اس میں سے چند پیسے بطور ''زکوٰۃ'' ادا کر دیئے جائیں۔ ربوٰ کا نام (جسے قرآن نے ''خدا اور رسول'' کے خلاف بغاوت قرار دیا ہے)۔ منافع رکھ دیا گیا ہے، خواہ وہ بینکوں میں جمع کردہ رقوم پر ہو، اور خواہ کاروبار میں (Sleeping Partner) کے طور پر جس کے لئے فقہ کی اصطلاح مضاربت

اختیار کر لی گئی ہے۔ زمین پر بے حد و نہایت ملکیت جائز ہے بشرطیکہ اس سے ''عُشر'' ادا کر دیا جائے۔ اس قسم کے منافع کو مزارعت کہہ دیا گیا ہے۔ یہ نظام سرمایہ داری کی وہ شدید شکل ہے جس میں اب خود نظامِ سرمایہ داری کی حامل اقوامِ مغرب بھی لچک پیدا کرتی جا رہی ہیں۔ یہاں اسے اسلام کے معاشی نظام کے نام سے رائج اور مستحکم کیا جا رہا ہے۔ یہی اقوامِ مغرب کا منشاء تھا۔

فنڈامینٹل ازم:

ہندو، ہماری مذہبی پیشوائیت اور اقوامِ مغرب کی یہ تثلیثی سازش آہستہ آہستہ زمین گیر ہوتی چلی گئی۔ لیکن اس کی رفتار بڑی سُست تھی اور اقوامِ مغرب یہ خطرہ محسوس کر رہی تھیں کہ ان کی یہ آہستہ خرامی رفتہ رفتہ جمود کی حد تک نہ پہنچ جائے۔ اس خطرہ کے ازالہ کے لئے انہوں نے ایک نئی ترکیب سوچی۔ اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے عہدِ ملوکیت میں وضع شدہ ''اسلام'' کی شراب کہن کو نئی بوتلوں میں اس طرح بند کیا جائے کہ اصلی اور نقلی میں فرق نہ کیا جا سکے۔ اس نئی تحریک کا نام انہوں نے (Funda Mentalism) رکھا جس کے لغوی معنیٰ ''بنیادی اسلام'' کے ہیں۔ اس تحریک کو انہوں نے اس قدر عام کیا ہے کہ مسلم ممالک میں ہی نہیں، یورپ، امریکہ، کینیڈا تک میں ہر جگہ اس کی شاخیں قائم کر دی گئی ہیں، اور وہاں کے نامور مذہبی پیشوا اور قدامت پسند پیشہ وران کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے روپے کے سیلاب کے بند اس طرح کھول دیئے ہیں کہ سب اس میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ جس اسلام کو یہ لوگ پیش کر رہے ہیں وہی ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا لیکن اس کے لئے اسلوبِ بیان ماڈرن اختیار کیا جاتا ہے۔ اس سے ''ہمارا وہ طبقہ جو مولویوں سے متنفر تھا ان کی باتیں کان لگا کر سنتا ہے، حالانکہ ان کی باتیں بھی وہی ہوتی ہیں جنہیں مولوی صاحبان پیش کرتے تھے۔ اس طرح یہ تحریک روپے کے زور اور پراپیگنڈہ کے شور سے کامیاب ہو رہی ہے۔ خواص کی نگاہوں میں ''ماڈرن ازم'' کی چمک سے اس قدر خیرگی پیدا کی جا رہی ہے کہ ان میں حقیقت اور فریب میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رہی، اور عوام کے لئے مذہب کی رسمی تقریبات کو اس قدر پُرکشش، بارونق اور

مقدس بنایا جا رہا ہے کہ وہ سامریت کے اس دامِ ہمرنگِ زمین سے نکل ہی نہیں سکتے۔

یہی تھا وہ نظام جس کی محکمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ''شعبۂ اسلام'' کے مشیر نے کہا تھا کہ۔

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں غلام
ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!
یہ ہماری سعئ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام!
ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا؟
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

(ارمغانِ حجاز، ص:215،216)

اور اس میں تحریکِ پاکستان کے مخالفین اور اقوامِ مغرب واقعی کامیاب ہیں۔

پاکستان کا مقصد:

یاد رکھئے! جس مملکت کے قیام کا تصور اقبالؒ نے دیا تھا اور جس کے لئے قائداعظمؒ کی سعی پیہم کے تصدق ایک خطۂ زمین حاصل ہوا تھا، اسے اپنی مقصدیت کے اعتبار سے اسلامی مملکت بننا تھا۔ وہ مقصدیت یہ تھی کہ اس میں:

1۔ حقِ حکومت کسی انسان یا انسانوں کے گروہ کو حاصل نہیں ہوگا۔ حکمرانی صرف کتابِ اللہ (قرآن) کی ہوگی۔

2۔ اس میں غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز، اسلامی اور غیر اسلامی کی سند اور اتھارٹی قرآن

مجید ہوگا۔

3۔اس میں کسی کو نہ کسی قسم کا خوف ہوگا، نہ حزن۔خوف ہوگا تو صرف قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کے مضرت رساں نتائج کا جن کا اطلاق ہر ایک پر یکساں ہوگا۔

4۔اس میں نہ کوئی فردرات کو بھوکا سو سکے گا۔نہ کسی کی کوئی ضرورت رُکی رہے گی۔

5۔اس میں امیر اور غریب، محتاج وغنی، حاکم ومحکوم کی تمیز نہیں ہوگی۔تمام انسان یکساں واجب التکریم ہوں گے اور تذلیل وتوہینِ آدمیت سنگین ترین جرم ہوگا۔

6۔اس میں وہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے گا، نہ مذہبی پیشوائیت کا وجود۔اُمت کے باہمی مشورہ سے نظامِ حکومت قائم ہوگا اور وہ نظام قرآن مجید میں متعین کردہ غیر متبدل حدود کے اندر رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قواعد وضوابط خود مرتب کرے گا۔انہی کو احکامِ شریعت کہا جائے گا۔

7۔اس میں ساری اُمت، اُمتِ واحدہ ہوگی جس میں کسی قسم کا تفرقہ نہیں ہوگا۔

یہ تھا وہ نظام جسے قائم کرنے کے لئے پاکستان کا خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔اس کے مخالفین کی انتہائی کوشش تھی کہ اوّل تو یہ خطۂ زمین ہی حاصل نہ ہو، اور اگر حاصل ہو بھی جائے تو اس میں یہ نظام قائم نہ ہو سکے (جسے الدین کہا جاتا ہے)۔اس کے بجائے اس مذہب کا دور دورہ ہو جس سے انسان نہ دین کا رہتا ہے، نہ دُنیا کا، اقبالؒ کے الفاظ میں ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ؎

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ وخدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

قائداعظمؒ نے تحریکِ پاکستان کے دوران کہا تھا:

''ہماری حفاظت، ہماری نجات اور عزت وآبرو (کے تحفظ کا واحد ذریعہ) پاکستان ہے۔اگر ہم اس جد وجہد میں ناکام رہ گئے تو ہم تو تباہ ہو ہی جائیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی اس برصغیر میں نہ مسلمانوں کا وجود باقی رہے گا۔نہ اسلام کا نام ونشان۔'' (تقاریر، جلد دوم، ص:255)

اگر قائداعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ پاکستان مل جانے کے بعد بھی اس اسلام پر کیا بیت رہی ہے جس کے احیاء کے لئے انہوں نے پاکستان لے کر دیا تھا۔

بہرحال، ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہم اس میں ناکام رہ گئے اور پاکستان کے مخالفین کامیاب ہوگئے۔ یہ بدقسمتی ہماری ہی نہیں۔ پوری کی پوری انسانیت کی بدقسمتی ہے کیونکہ پاکستان نے اس نظام کی تجربہ گاہ بننا تھا جس سے نوعِ انسان نے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنا تھا۔ اس اعتبار سے ہم اپنی بدنصیبی کے بھی ذمہ دار اور مجرم ہیں اور عالمگیر انسانیت کی بدنصیبی کے بھی ذمہ دار اور مجرم، ہزار سال کے بعد یہ نادرِ روزگار موقعہ ہمیں میسر آیا تھا ہم نے اسے بُری طرح کھودیا۔ اے وائے ما! اے وائے ما!!

جبیں را پیش غیر اللہ سودیم
چو گبراں در حضورِ او سرودیم
ننالم از کسے، می نالم از خویش
کہ ما شایانِ شانِ تو نبودیم

(ارمغانِ حجاز، ص: 51)

مجھ سے اکثر تقاضا کیا جاتا ہے کہ میں اقبالؒ کے فارسی اشعار کا ترجمہ بھی پیش کر دیا کروں۔ میں ان اشعار کا ترجمہ کیا کروں؟ یہ تو اپنی لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنا ماتم کرنا ہے۔ ہر چند کہ ماحول کی افسردگی طبیعت کو اس طرف آنے نہیں دیتی لیکن غالب نے اس مفہوم کو اپنے شوخ وشنگ انداز میں جس طرح ادا کیا ہے اس سے بات سمجھ میں آجائے گی اُس نے کہا ہے:

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے!
غافل! ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہئے

جن رفعتوں اور عظمتوں کا آئینہ دار وہ اسلام تھا جس کے لیے ہمیں یہ خطہ زمین عطا ہوا تھا

اس اسلام کو نافذ کرنے والے انسان بھی اتنے ہی بلند اور عظیم ہونے چاہئیں تھے۔ ہمارے جیسے پست قامت ان بلندیوں تک پہنچنے کے قابل نہیں تھے، اس لیے ہم اس نعمت کبریٰ کے اہل نہیں قرار پائے۔ جو تیشۂ فرہاد اُٹھانے کی ہمت نہ رکھتا ہو، اسے جوئے شیر کیسے مل سکتی ہے؟ ہمیں اپنے اندر یہ ہمت پیدا کرنی چاہئے تھی۔ قرآن کریم نے ''اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ'' (تم سب پر غالب آجاؤ گے) کے لئے اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۔ (اگر تم مومن ہوتے) کی شرط عائد کی تھی۔ ہم نے اس شرط کو پورا نہ کیا تو اس مقام تک پہنچ نہ سکے۔

مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کی تاریخ دُہرائی جارہی ہے۔ فرعون کی غلامی میں وہ ضعف و بیچارگی کی انتہا تک پہنچ گئے تو مشیتِ خداوندی نے اُن کی حالت پر رحم کھایا اور چاہا کہ انہیں تمکن فی الارض حاصل ہوجائے۔ (38:6-5)۔ اس کے لئے انہیں ایک خطہ زمین عطا کر دیا گیا۔ (قرآن کے الفاظ میں) اسے ان کے نام لکھ دیا۔ (5:21) لیکن جب وہ اس کے اہل ثابت نہ ہوئے تو تقدیر امم کے اٹل قانون کی رُو سے فیصلہ ہوا کہ: فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيۡهِمۡ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ (5:26)۔ جس زمین کا پٹہ ان کے نام لکھ دیا گیا تھا، اس سے انہیں محروم کر دیا اور کہہ دیا کہ وہ چالیس سال تک خانہ بدوشوں کی طرح صحرانوردی کریں اور اپنے اندر تمکن فی الارض کی صلاحیت پیدا کریں۔ خدا کرے کہ ہمارے جرائم کی سزا ابدی محرومی نہ ہو۔ وقتی ہو اور جس طرح بنی اسرائیل کی اُس نسل کے بعد آنے والے مؤرخ نے اُسی سرزمین میں سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانیؑ کا نظارہ کیا تھا، ہمارا آنے والا مورخ بھی اُس نظام کی جنت آفرینیوں کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے جس کے لئے یہ خطۂ زمین ہمیں عطا کیا گیا تھا۔ اُس کی رحمتِ بے پایاں نے، جنت سے نکلے ہوئے آدم کو جنت کی بازیابی کا وعدہ بھی تو دلایا تھا۔ لیکن یہ جنت مفت میں نہیں مل جانی تھی۔ اس کے لئے فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ (2:38) کی شرط لازم تھی۔ اس طرح حاصل کردہ جنت کو کوئی چھین نہیں سکتا۔

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ
تا جزائے عملِ تست، جناں چیزے ہست

مفہوم: وہ بہشت جو تمہیں (بھیک میں) بخشی گئی ہو، کسی کام کی نہیں۔ وہ جنت جو تمہاری جدوجہد اور محنت کے نتیجے میں وجود میں آئے، اس کی کیا بات ہے۔

ہمیں یہ خطۂ زمین ملا ہی اس لیے تھا کہ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ (10:14)۔ ''ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو؟'' ہم نے جس قسم کے کام کیئے اُسی قسم کا نتیجہ ہمارے سامنے آ گیا۔ یہاں تو

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

لیکن مجھے تو داستانِ بنی اسرائیل کو اپنے حال پر منطبق کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ ان کے متعلق قرآن نے بتایا ہے کہ اس کی تمکن فی الارض سے عارضی محرومی کے بعد، نئی نسل کے نوجوان (حضرت) موسیٰؑ پر ایمان لے آئے اور ان کے جوشِ کردار نے مخالفت کے ہر بند کو توڑ کر تمکن حاصل کر لیا۔ لیکن ہماری نئی نسل کو تو اس مقام پر پہنچا دیا گیا ہے جہاں وہ اسلام کے نام تک سے متنفر ہو رہی ہے۔ اس کا اگلا قدم سیکولرزم ہوگا۔ اُس وقت بھارت کا ہندو مسلمانوں کی وہ تمام جماعتیں جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور اقوامِ مغرب اپنی اس کامیابی پر جشنِ مسرت منائیں گی کہ:

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

مفہوم: بلا سر پر آ گئی تھی لیکن شکر ہے ٹل گئی!

اس سے اُن کے دل پر کیا گزرے گی جنہوں نے اس خطۂ زمین میں قرآنی نظام کا خواب دیکھا تھا، اس کی بابت مت پوچھیئے۔

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے!

لیکن اس کے باوجود، جب تک میرے دم میں دم ہے مَیں قرآن کی آواز بلند کیئے جاؤں گا کہ میرے سامنے اُس کا یہ وعدہ موجود ہے جو کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، کہ اس نظام کو دُنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے۔ یہاں نہ سہی کہیں اور سہی۔

1۔ محفلِ ما بے مے وبے ساقی است
ساز قرآں را نوا ہا باقی است

2۔ زخمۂ ما بے اثر افتد اگر
آسماں دارد ہزاراں زخمہ در

3 حق اگر از پیشِ ما بر دار دش
پیشِ قومے دیگرے بگذاردش

4۔ ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

(جاوید نامہ،ص:91)

ترجمہ:

1۔ ہماری محفل شراب اور ساقی کے بغیر ہے،مگر قرآن کے ساز کے نغمے اپنی جگہ برقرار ہیں۔

2۔ اگر ہماری مضراب میں کوئی اثر نہیں رہا تو آسمان کے پاس ہزاروں اور سازندے موجود ہیں۔

3۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے (قرآن کو) ہمارے سامنے سے اٹھالے تو وہ اسے کسی اور قوم کے سامنے رکھ دے گا۔

4۔ میں اس دن سے ڈرتا ہوں کہ مسلمان کو قرآن سے محروم نہ کر دیا جائے۔اور مولا کریم اپنے عشق کی آگ کسی اور کے دل پر نہ ڈال دے۔

قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک ضابطۂ حیات قرار دیا ہے، اس لئے اس کا نظام نہ کسی خاص خطۂ زمین سے وابستہ ہے۔ نہ کسی خاص قوم تک محدود، اور نہ کسی خاص زمانے سے مختص۔ جو قوم جس ملک اور جس زمانے میں بھی اس کے حقائق پر علم وبصیرت اور عقل وفکر کی رُو سے غور کر کے انہیں اختیار کرلے گی وہ اس سے فیضیاب ہو جائے گی۔

مذہب پرست قومیں جو اپنی خوش فہمیوں میں مست اور توہم پرستیوں میں مطمئن رہتی ہیں ان کے حصے میں یہ سعادت نہیں آسکے گی۔ دانش ورانِ مغرب، اپنے موجودہ نظامِ حیات سے تنگ آ کر ایک نئی دُنیا اور اس میں ایک جدید نظام کی تلاش میں ہیں۔

ایک ایسی دنیا جس میں نہ کرۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں انسان جہاں جی چاہے آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے، اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے مسرت حاصل کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مُراد ساری دنیا کی واحد حکومت ہوگی۔ جو جمہوری طور پر تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔ ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی اسی قسم کی حسین دُنیا کا تصور محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

(Beyond the welfare state, By. Gunner Myrdal)

یہ دُنیا ایک ایسے مذہب کی رہینِ منت ہوگی:

''جو انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب کی تعلیم کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و فکر پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اُسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔''

(The Sane Society; by Erich Fromm)

ہم نے اس مقام پر دانش ورانِ مغرب میں سے صرف دو ایک کے خیالات پیش کئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سب اپنی نیشنلزم کے ہاتھوں نالاں ہیں کہ دُنیا میں جنگوں کے لامتناہی سلسلہ کا بنیادی سبب یہی ہے۔ وہ اپنے ہاں کی جمہوریت سے تنگ آ چکے ہیں کہ ان کے نزدیک

یہ بھی ملوکیت ہی کا پرتو ہے۔ مغربی سرمایہ پرست قومیں اپنے معاشی نظام کو عالمگیر تباہی کا موجب قرار دیتی ہیں۔ اس کے برعکس روس اور چین کی سوشلزم بری طرح ناکام ثابت ہو رہی ہے اس حصہ لا کے بعد جب وہ الا (مثبت نظام) کے متعلق سوچیں گے تو وہ قرآن کے سوا کہیں نہیں ملے گا۔ اس طرح ۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

والسلام